''میرے دل میں غالب کا دیوان پھڑ پھڑانے لگا۔''لیکن چھ سال بعد اس کا کیا بچا ہوگا؟''

''بچا تو کچھ نہ ہوگا۔''اس نے اپنا منہ اُوپر اُٹھایا۔''پر اتنے عرصے کے بعد آج پھر ایک حماقت کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

امر ان باتوں بالکل نہ سمجھ سکا۔اس کے ذہن پر شاید ابا جان کا بھوت مسلط تھا۔لیکن میرے دل و دماغ پر غالب کی وہ ساری غزل لکھی جا رہی تھی۔۔۔۔''مدت ہوئی ہے یار مہماں کیے ہوئے، جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے، چاکِ گریباں کیے ہوئے، تصورِ جاناں کیے ہوئے۔تہیہ طوفاں کیے ہوئے۔۔۔''لیکن طوفان تو گزر چکا تھا اور میں تو گرے ہوئے پتوں کے انبار میں سے کچھ پتے نکالنے کے کام پر مامور تھا۔

رات کو امر اپنی چارپائی میرے کمرے میں اٹھا لایا۔بہت دیر تک باتیں کرتا رہا لیکن میں نے شاید ہی اس کی کسی بات کا جواب دیا ہو۔پر جب وہ نمّی کی کوئی بات کرتا تو میں غور سے سنتا اور شوق سے جواب دیتا۔سونے سے پہلے اس نے اپنی قمیص اتار کر کہا۔''آپ کو نمّی جتنی اچھی لگتی ہے مجھے اتنی ہی بری۔''اور پھر کروٹ بدل کر خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن صبح نمّی نے امر کو جھنجھوڑتے ہوئے میرے گال پر بھی ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔میں نے ویسے ہی آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا۔''بھئی ہم تو جاگ رہے ہیں۔یہ سزا کس جرم کی ہے۔''

''جاگ رہے ہیں تو اُٹھیے نا۔''اس نے میری ناک اینٹھی۔''جب بڑے ہی دن کے دس بجے تک سویا کریں گے تو چھوٹوں سے کوئی کیا کہے گا؟''

جب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے امر کی الٹی قمیص سیدھی کرتے ہوئے کہا۔''اتنی چھوٹی ریاست سے اتنی بڑی تنخواہ پاتے ہو۔کچھ کام بھی کیا کرو۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی ہوئی فائلوں کا پلندہ اٹھا لیا اور بغیر کچھ بولے کاغذات الٹنے لگا۔نمّی جو کچھ کہتی تھی اس کا جواب دینے کی بجائے اس پر عمل کرنے پر لطف آتا تھا۔

امر سکول چلا گیا تو وہ نمک مرچ لگے کھیرے کی پھانکیں کھاتے کمرے میں آئی۔ایک پھانک مجھے دے کر کہا۔''اس میں فولاد ہوتا ہے۔ہر روز نہار منہ کھانے سے آدمی ایسا ہو جاتا ہے۔''اس نے اپنا عنابی ڈوپٹہ دکھایا۔میں پھانک کھانے لگا اور اس نے کھونٹی سے میرا ہیٹ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔پھر آئینے میں دیکھ کر بولی۔''میں تم لگتی ہوں نہ؟''

میں ہنسا تو اس نے ہیٹ ذرا ٹیڑھا کر کے کہا۔''اب تو لگتی ہوں نا۔یہ دیکھو تمہاری ایسی ٹھوڑی اور یہ ٹھوڑی کا تل ہو بہو تمہاری ناک ہے۔اور تمہاری چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔۔۔۔۔۔اور یہ دیکھو۔تمہارے ماتھے کی لمبی لمبی سلوٹیں۔''پھر اس نے اپنی لٹکتی ہوئی چوٹی کا گچھا بنا کر ٹوپ میں رکھ لیا اور بولی۔''اب؟''

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہ کرسی پر ٹانگ رکھ کر بولی۔''تمھیں نجمہ سے محبت تھی؟''

میں بوکھلا گیا۔''محبت؟لیکن یہ تمہیں کہاں سے یاد آ گیا؟''

''ایسے ہی۔۔۔۔۔جب ہمارے سکول میں ڈرامہ ہوا تھا تو نجمہ انٹینی بنی تھی۔۔۔۔۔بتاؤ نہ تمہیں اس سے محبت تھی؟''

''میں نے جواب دیا۔''نہیں!''

''لیکن اسے تو تھی۔''

''ہوگی۔۔۔۔۔کون ہے دنیا میں یہ حماقت نہیں کرتا۔''

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔گھٹی ہوئی آواز میں اس نے میرے ہی الفاظ دہرائے۔''ہاں،کون ہے دنیا میں یہ حماقت نہیں کرتا۔''

''لیکن پمّی۔''میں نے اس کا راستہ روک لیا۔''یہ حماقت کوئی بری چیز تو نہیں۔''

''بھئی ہوگا۔''اور وہ چلی گئی۔اتنے میں خدادادآ گیا۔اس نے بتایا کہ محمد دین ٹرک لے کر آ گیا ہے۔وہ ان دونوں لڑکیوں کو ہندوستان سے لے جائے گا۔کیوں کہ اب ان کا زیادہ دیر یہاں رہنا مناسب نہیں۔

میں نے کہا۔''ٹھیک ہے۔لیکن تم محمد دین کو ابھی نہ جانے دو۔کھانا وانا کھلاؤ اور دلگن میں گوندنی لے نیچے اس کی چارپائی ڈال دو۔اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ذرا آرام تو کرے۔کل صبح بھیج دیتا۔''

خدادادچلا گیا اور میں بغلی غسل خانے میں جا کر کپڑے اتارنے لگا۔پانی خوب ٹھنڈا تھا۔دیر تک نہاتا رہا۔رات کے باسی پانی نے جسم میں ایک نئی تازگی پھونک دی۔ٹھنڈے دماغ نے پمّی بہت سے برفانی مجسمے تراشے اور تصور کی آنکھ کو ترسانے لگا۔جب میں نہا کر نکلا تو دونوں بازیافتہ لڑکیاں کوٹھڑی کی دہلیز سے لگی بیٹھیں تھیں۔ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ان کی نگاہیں پھٹیں ہوئیں تھیں اور اپنے آپ سے پھٹیں ہوئی تھیں۔میں نے انہیں رحم بھری نظروں سے دیکھا نہ قہر آلود نگاہوں سے۔یونہی پاس سے گزرتے ہوئے وہ میرے سامنے آ گئیں تھیں۔

دوپہر کو میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔پمّی بریکٹ صاف کر رہی تھی کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ایک رجسٹرڈ لفافہ لایا تھا۔میں نے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر ادھر اُدھر دیکھا تو پمّی نے فوراً اپنا ایور شاپ پن نکال کر مجھے دے دیا۔میں نے دستخط کیے۔لفافہ کھول کر پڑا۔ایک عرضی تھی،ٹائپ کے دو صفحوں پر مشتمل تھی۔کسی مغویہ لڑکی کی روداد جو اس کے والدین نے پاکستان سے لکھ کر بھیجی تھی۔میں پہلی چند سطریں پڑھ کر ہی سارا مضمون سمجھ گیا اور اسے تپائی پر رکھ کر پن سے کھیلنے لگا۔نب میں ایک گہرا نشیب تھا۔میں پمّی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک دفعہ امر نے اس میں تختی پر لکھنے والی روشنائی بھر دی تھی اور پمّی نے صفائی کے لیے رومال میں نب لپیٹ کر بری مشکل سے دانتوں میں پکڑ کر پن سے باہر کھینچی تھی۔جہاں رومال کی تہہ اکہری تھی وہاں دانت کا گہرا نشان پڑ گیا۔یہ داستان سن کر پمّی ادھر اُدھر جھاڑن مارنے لگی۔تپائی کی باری آئی تو عرضی جھٹکے سے نیچے گر گئی۔میں نے اٹھا کر پن سے اس کے حاشیے پر ذرا ٹیڑھا کر کے لکھ دیا۔''بہت کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔''

جب وہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھ چکی تو تپائی سے عرضی اٹھا کر پڑھنے لگی۔پڑھنے کے دوران میں اس نے مجھ سے انگریزی کے دو مشکل الفاظ کے معنی پوچھے۔جب پڑھ چکی تو کاغذ ٹیڑھا کر کے میرا ریمارک پڑھا اور جھنجھلا کر عرضی کو میری گود میں پھینک

دیا۔ ''کتنے سنگدل ہو تم؟''

میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھند کا ایک ہلکا سا غبار چھا گیا تھا۔ دن بھر وہ میرے کمرے میں نہ آئی۔ امر بھی غائب رہا۔ مجھے سخت افسوس تھا کہ اس کو میرے سنگدلانہ رویئے سے دکھ پہنچا۔ ندامت بھی تھی۔ لیکن احساس ندامت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا خلا تھا جس میں ہر جذبہ، ہر احساس آن کی آن میں کھو جاتا۔ میں کام کرتا تھا بالکل مشین کی طرح سوچتا بھی مشین ہی کی طرح تھا۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ اور بہت دیکھا تھا۔ لیکن اس پر، باوجود اس کے میری اپنی آنکھوں نے دیکھا تھا، یقین نہیں آتا تھا۔ ٹرک چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے نہ چل رہے ہوں۔ مغویہ لڑکیاں برآمد کی جا رہی ہیں شاید نہ کی جا رہی ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے۔ کیا پتہ ہے۔ نہ بنا ہو۔ میں میں ہوں اور پمّی پمّی۔۔۔۔ ممکن ہے غلط ہو۔۔۔۔ میں سنگدل نہیں تھا۔ دراصل پتھروں میں گھِر کر پتھرا گیا تھا۔ میرا احساس، میرا تخّیل میرا وجدان سب پتھرا گئے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک میری انگلی میں کوئی چیز چبھی۔ چونکا تو معلوم ہوا کہ عرضی پر سے اپنا لکھا ہوا ریمارک بلیڈ سے کھرچ رہا تھا۔ اب کاغذ پر وہ پتھر نہیں تھے۔ ''بہت کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔''

شام مٹیالی سے اندھیری ہو گئی۔ چمگادڑیں گلی میں ادھر اُدھر منڈلانے لگیں۔ ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ خداداد، محمد خان اور محمد دین چبوترے پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی آدمی ان کے پاس سے گزرتا ہوا صاحب سلام کہہ دیتا تو وہ تینوں یک زبان ہو کر اس کا جواب دیتے حقّے کی گڑگڑاہٹ جھیل میں ڈوبتی ہوئی گاگروں کی طرح خوف ناک آوازیں نکال رہی تھی۔ دونوں بازیافتہ لڑکیاں ابھی سوئی نہیں تھیں۔ لیکن ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ان کی شکستہ قسمت گہری نیند سو رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے آ کر میرا سر چھوا۔ میں چونکا۔ پمّی لبوں پر انگلی رکھے خاموش کھڑی تھی۔ مجھ پر جھک کر بولی۔ ''آج میری مدد کرو۔ میں بڑی بپتا میں ہوں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے ایک لڑکی کے اغوا کرنے میں مدد دے سکتے ہو؟''

''اغوا؟''

''شی شی۔'' اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور میز سے میرے کاغذات اٹھا اٹھا کر اٹیچی کیس میں ڈالنے لگی۔ بریکٹ سے کنگھی، تیل اور شیو کا سامان اٹھا کر رکھا، کونے سے سلیپر اٹھائے اور ان کو ٹھونسا۔ کھونٹی سے ٹائیاں اتار کر ایک کونے میں گھسیڑ دیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا تو مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اور کچھ؟''

''تو جلدی کرو۔ خداداد سے کہو، برتن سمیٹ کر ٹرک میں رکھے، لڑکیوں کو بٹھائے'' میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ ''لیکن تم کیا کر رہی ہو؟''

''ذرا صبر کرو! ذرا صبر کرو!''

اٹیچی کیس اٹھا کر وہ باہر نکل گئی اور اسے محمد دین کے ہاتھوں میں دے کر بولی۔ ''اسے لے جا کر ٹرک میں ڈال دو اور یہ سارے برتن بھی اور ان لڑکیوں کو بھی وہیں لے جاؤ۔''

محمد دین مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں صاحب؟''

میں صرف اس قدر کہہ سکا۔ ''ہاں ہاں۔''

محمد دین جانے لگا تو پمّی نے مدھم آواز میں کہا۔ ''اور دیکھو ٹرک دلگن سے نکال کر گلی میں لے جانا۔'' پھر خدادادا اور محمد خان سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''جاؤ! تم بھی ٹرک میں جاؤ!'' خدادادسٹ پٹایا ضرور مگر بڑبڑایا نہیں۔

جب ہم اصطبل کے پہلو سے گزرنے والی اندھیری گلی میں جا رہے تھے تو پمّی نے کہنا شروع کیا۔ ''سجن سنگھ بہت برا آدمی ہے۔ میں عرضی میں آج اس کا نام پڑھ کر ہی حسنا کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ گو وہ پتا جی کا دوست ہے اور میں اسے چاچا کہتی ہیں پر وہ چاچا کہلانے کا مستحق نہیں۔۔۔۔ کاش تم نے حسنا کے باپ کی عرضی شروع سے آخر تک پڑھی ہوتی۔''

''میں بہت نادم ہوں، پمّی۔ مجھے معاف کر دو۔ دراصل۔۔۔۔'' اور میں اسے ساری ٹریجڈی کا نقشہ کھینچ کر اپنے دل کی حالت بیان کرنے ہی والا تھا کہ اس نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں ہاں! میں معاف کر دوں گی۔ ضرور معاف کر دوں گی۔'' ایک دم اس کی آنکھیں اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکی اور اس نے گھبرا کر کہا۔ ''ذرا تیز قدم اٹھاؤ۔ چاند نکلنے ہی والا ہے۔''

مجھے سجن سنگھ کے مکان کے پچھواڑے کھڑا کر کے وہ اندر چلی گئی اور دس پندرہ منٹ تک وہاں باتیں کرتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے اس کے مصنوعی قہقہے سنائی دیتے جس میں سجن سنگھ اور اس کی بیوی کی کھوکھلی ہنسی بھی شامل ہوتی۔ جب وہ باہر نکلی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ جو کچھ کہتی سمجھ نہیں آتا تھا۔ بے چین ہرنی کی طرح وہ کبھی ادھر جاتی اور کبھی اُدھر۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ میں تعمیلِ حکم کی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور ڈگمگاتی ہوئی ٹانگوں سے وہ میرے کندھوں پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بوجھ سے شانوں پر لگے ہوئے سٹار میرے جسم میں کھب گئے۔ زخم خوردہ ٹھوڑی میں نے اس کی گندھی ہوئی چپل کے ریشمی پھول پر رکھ دی۔ ایک یہی علاج تھا۔ جب وہ اترنے لگی تو پیچھے کو ڈول گئی۔ توازن قائم رکھنے کے لیے اس نے میرے بالوں کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب وہ اتر چکی تو چھت سے ایک اور ٹانگ لٹکی۔ حسنا اتر رہی تھی۔ چوروں کی طرح قدم اٹھاتے ہم ٹرک تک پہنچے۔ محمد خان تختہ گرائے کھڑا تھا۔ جب حسنا بیٹھ گئی تو پمّی نے خدادادا اور محمد خان سے کہا۔

''اپنی سٹین گن میں میگزین چڑھا لو۔ سجن سنگھ بہت برا آدمی ہے۔''

''لیکن تم۔۔۔۔۔ تم پمّی۔۔۔۔۔'' میرا گلا رُندھ گیا۔

''ہاں میں۔۔۔۔ تم میری فکر نہ کرو۔ اب یہاں سے چل دو۔ دیکھو چاند نکل آیا ہے۔'' اور ہم چل پڑے۔

حسنا خاموش تھی۔ لیکن اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ پمّی خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہیں تھیں۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ کتنی اداس چمک تھی۔ بالکل غالب کے شعروں کی طرح۔ دونوں بازیافتہ لڑکیاں بھی خاموش تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ سامنے نیم تاریک سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں جس کو ٹرک چاٹتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔

خدادادا اور محمد خان خدا معلوم کیا سوچ رہے تھے۔ پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی پھیل رہی تھی۔ پمّی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے جانے اس نے کیوں پوچھا۔ ''پاکستان سے تمہارے لیے کیا بھیجوں، پمّی؟''

پھر جانے خود ہی کیوں کہا۔"تمہارے مطلب کی چیز وہاں کیا ہوگی؟"

"کیوں نہیں۔"پمّی کے لہجے میں کامل وثوق تھا۔اس کی آنکھوں میں غالب کے اداس شعر چمکے۔"مجھے پھولوں سے بہت پیار ہے۔میں ان پر جان دیتی ہوں۔ہو سکے تو وہاں سے"۔۔۔۔حسنا اور دو بازیافتہ لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے۔"ایسے پھول بھیجتے رہنا۔میں تمہیں بہت یاد کیا کروں گی۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔اچھا اب تم جاؤ۔دیکھو کتنی روشنی پھیل گئی ہے۔"

جہاں پمّی کو اترنا تھا۔وہاں ٹرک رکا۔پمّی نیچے اتری۔حسنا کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔میں نے ہولے سے کہا۔"پمّی۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔میری آنکھیں دھندلا گئیں۔پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی میں اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔"الوداع۔۔۔۔"

میرا سارا وجود دکھو کھلا ہو گیا۔"الوداع،پمّی۔"

وہ مسکرائی۔"مجھے غالب کا دیوان انعام میں ملا لیکن افسوس کہ میں غالب کو سمجھ نہ سکی۔۔۔۔ایک شعر ہے اس کا۔۔۔۔۔۔موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے۔تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے۔۔۔۔۔۔جانے کیا مطلب ہے اس کا؟" اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ایک بار بھی اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔انجن سٹارٹ ہوا اور ٹرک سڑک کے پتھروں پر رینگنے لگا۔

مسکن

یہاں پہنچ کر یہ پگڈنڈی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے دونوں کناروں پر کھجور کے نوعمر درخت اور ببول کے خاردار پیڑ بھی۔ اب کیکر اور ڈیلیا کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ادھر اُدھر سر جھکائے کھڑی ہیں۔ میں اس کے چبوترے پر بیٹھا گاؤں کے تنوروں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھ رہا ہوں جن میں بہت سی جانی پہچانی صورتیں گھوم رہی ہیں۔ سامنے نیم کے کسیلے اور بکائین کے بکسیلے درختوں تلے وہ بوڑھا حقّہ پی رہا ہے جس کی آنکھوں میں اب شاید وہ پہلی سی چمک نہیں رہی۔ اس کی جھونپڑی سے اب بھی وہی دھواں نکل رہا ہے جو حیات کا سہارا اور زندگی کا آسرا ہے۔ اس کے بچے ایک پمپ چلا کر پیتل کی ایک گاگر بھر رہے ہیں۔ پتہ نہیں آگ اور پانی کا کھیل کب شروع ہوا اور کب تک جاری رہے گا۔ تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تمہیں بچپن ہی سے پانی کے کھیل بہت پسند تھے اور تم سردیوں کی یخ بستہ اور تاریک راتوں کو موم بتی جلا کر گڑیوں کے فراک بڑے شوق سے دھویا کرتی تھیں۔ اسی شوق میں بارش میں تمہیں نمونیا ہو گیا تھا۔ بڑا مہلک قسم کا نمونیا۔ اگر اس وقت تمہیں کچھ ہو جاتا تو میری زندگی کس قدر خالی ہوتی۔ بے جان گڑیوں کی آرائش کی خاطر اگر ایک جان چلی جاتی تو اور کسی کو شاید پتہ نہ چلتا لیکن مجھے ضرور محسوس ہوتا۔ اچھا ہی ہوا تم زندہ رہیں اور مجھ سے آملیں۔ اس کے بعد گڑیوں سے کھیلنے کا دُور تو ختم ہوا پر ٹھنڈے پانی میں جھاگ بنا کر منہ دھونے کا شغل جاری رہا۔ کاش تم یہ کھیل ابھی اور جاری رکھتیں۔ اس کے ساتھ تمہیں سردیوں کی پیداوار، نرگس کے پھولوں سے کتنا پیار تھا۔ ایک دن جب تم آپی کے کمرے میں گلدانوں میں پڑے ہوئے نرگس کے پھولوں کو نئی ترتیب دے رہی تھیں تو تم نے پتہ نہیں ہر پھول کو کتنی مرتبہ چوما تھا اور جب میں دہلیز پر آ کر کھڑا ہو گیا تو تم نے اپنا سویٹر نیچے کھینچ کر کتنی حسرت سے کہا تھا۔ ''ہائے پھول اگر بٹن ہوتے تو میں انھیں اپنے بسنتی سویٹر میں ٹانگ لیتی۔'' اس پر میں سوچنے لگا تھا کہ نرگس کے پھول کس طرح سخت ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ میں اب بھی اس بیگ میں یہ پھول لایا ہوں پر یہ تو اب بھی وہی مرجھانیوالے پھول ہیں، ٹانکنے والے بٹن نہیں اور اگر یہ بٹن بھی ہوتے تو مجھے اس واسی میں تمہارے مسکن کا نشان معلوم نہیں۔ لیکن اگر میں ان پھولوں کو اسی طرح اپنے ساتھ واپس لے گیا تو تم شاید ناراض ہو جاؤ گی۔ جیسے اپنی سالگرہ کی آخری تقریب پر میں تم سے روٹھ گیا تھا۔ وہ دن کس قدر سوگوار تھا!

میری سالگرہ کی آخری تقریب جسے میں اپنی بساط سے بڑھ کر دھوم دھام سے منایا تھا کس قدر سوگوار تھی جب تم نے مجھے کوئی تحفہ نہ دیا۔ گو میں جانتا تھا تم نہ آ سکو گی، تم مجبور ہو۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ تم ایک بار ہی آ جاتیں، صرف ایک بار اور پھر پلک جھپکنے میں لوٹ جاتیں۔ لیکن مجبوریاں پلک بھی تو نہیں جھپکنے دیتیں۔ دوسرے دن تم مجھے سکول جاتے ہوئے راستے میں ملیں۔ لیکن میں نے تمہیں بلایا نہیں۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اب ساری عمر تم سے نہیں بولوں گا اور شاید میری ضدّی طبیعت اس عہد کو پورا بھی کر لیتی اگر شام کو بُرش کرنے کے دوران میں میرے سیاہ کوٹ کا کالر نہ الٹ جاتا جہاں ریشم کے نرم تاگوں سے ایک ننھا سا نرگس کا پھول کڑھا ہوا تھا۔ جسکے نیچے تمہارے نام کا پہلا حرف بھی کشیدہ کیا ہوا تھا۔ وہ پھول تو شاید اس قدر خوبصورت نہ ہوتا جس قدر حسیں اس کا سہارا تھا۔ مجھے سالگرہ کا اس سے بہتر کوئی تحفہ نہ ملا تھا۔ اور نہ آئندہ توقع تھی۔ اس لیے وہ آخری تقریب بن کر رہ گئی۔ آج تک سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ تمہیں کشیدہ کاری کا وقت کیسے ملا؟ تم ہمارے یہاں آتیں بھی تو فوراً الٹے پاؤں واپس چلی جاتیں اور پھر تمہارا پھرا کوئی روز روز ہوتا تھا! یاد

ہے، ایک دن جب میں نے تمہیں کہا۔ ''ہر روز ہمارے یہاں آیا کرو۔'' تو جواب ملا تھا۔ ''یہ کیونکر ہوسکتا ہے!'' پھر میں نے کہا تھا۔ ''اچھا، ایک دن چھوڑ کر ہی سہی۔'' تو تم نے اس پر بھی مجبوری ظاہر کی۔ پھر میں نے کہا۔ ''وعدہ کرو کہ۔۔۔۔۔لیکن تم نے بات کاٹ کر کہا تھا کہ۔'' میں وعدہ کیسے کروں۔'' اس پر میں نے اتنا بھی تو کہہ دیا تھا کہ۔ ''بہتر ہوا گر تم اس دنیا میں ہی نہ رہوتا کہ میں آزادی سے تمہاری قبر پر آسکا کروں اور وہاں تم سے وہ ساری باتیں کہہ سکوں جواب تک نہ کہہ سکا تھا۔ تمہارے پہلو میں اتنی دیر بیٹھ سکوں جس کی ہر لحہ جوان ہوتی جارہی ہے۔۔۔۔۔'' لیکن تم نے کہا تھا۔ ''ایسے نہ کہو۔ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔ میں زندگی کی عزت کرتی ہوں۔ مجھے زمانہ کے بڑے سے بڑے مصائب موت کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ موت یقینی سہی۔ لیکن اس کی آمد سے پہلے اس کا نام میرے دل پر ہول طاری کر دیتا ہے۔ نہ! نہ! مجھے ڈراؤ نہیں۔'' پر میں تو اس کے متعلق ہی سوچتا رہا اور اس حسین خواب کی آرزو قوی تر ہوتی رہی۔ کاش یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا۔

وہ دن بھی یاد ہوگا جب میں امتحان دینے لاہور جارہا تھا تو تم بہانے بہانے مجھے الوداع کہنے آئی تھیں۔ میں نے پوچھا تھا۔ ''وہاں سے تمہارے لیے کیا لاؤں؟'' تو جواب ملا تھا۔ ''اوّل پاس لوٹیے۔ یہ تحفہ یادگار رہے گا۔'' میں واپس آیا تو تم مجھ سے پرچوں کے بارے ہی پوچھتی رہیں اور کسی چیز کا ذکر نہ کیا۔ میں نے یہی بیگ کھول کر تمہیں سیاہ رنگ کا ابریشمی ''ہیرنٹ'' اور وینس کی رنگ برنگی پنسلوں کا ایک ڈبہ دیا۔ ایک بار تم نے کہا تھا نا نٹ بال کھیلتے ہوئے تمہارے بال بیحد پریشان ہو جایا کرتے ہیں اور پنسلوں کا ڈبہ؟ وہ تو میں یونہی لے آیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا۔ ''ان سے کس کی تصویر بناؤں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کی جس کا یہ ہیرنٹ ہے۔'' تو تم نے کہا تھا۔ ''اس کی نہیں جو یہ نٹ لایا ہے؟''

یوں تو دنیا میں ایسے ہوتا آیا ہے۔ مگر تم سے اس طرح آنکھیں پھر لینے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ میں اس ویران وادی میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں مگر تمہیں شاید معلوم نہیں اور اگر تمہیں معلوم بھی ہو جائے تو پھر بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ اب تم پہلے سے بھی زیادہ مجبور کر دی گئی ہو۔ پر تم اپنے اس طرح معذور ہو جانے کی اطلاع تو بھیج سکتی تھیں۔ تمہاری اس دل نواز محبت کو کیا ہوا؟ اگر تم اس وقت سے پہلے مجھے لکھ بھیجتیں تو کیا ہم کوئی تدبیر نہ لڑا سکتے؟ تم نے مجھے اس قدر کمزور کیونکر سمجھا؟ کیا مجھ میں نبرد آزمائی کی قوت نہیں؟ کیا میرے کندھوں پر ایک شاطر کا سر نہیں؟ اور فرض کرو ہم کو حل دینا نہیں آتا تو کیا ہم خوشامد کے بھی اہل نہ تھے؟ گاؤں سے اب ہولے ہولے ڈھول بجنے کی آواز آ رہی ہے۔ ابھی اس پر زور سے دڈ نکا پڑے گا۔ اور پھر اس گاؤں کے سارے جوان جھومر ڈال کر ناچنے اور گانے لگیں گے۔

روگاں دی ماری جندڑی علیل اے

سوہنا نہیں سُن داساڈی اپیل اے

.....اور میں اس چبوترے پر جس کی آدھی سے زیادہ اینٹیں کھڑ چکی ہیں بیٹھا ہوا ہوں۔ میری نہ تو جندڑی علیل ہے اور نہ مجھے اپیل کی ضرورت محسوس ہے۔ نیم اور بکائین کے جھنڈ تلے وہ بوڑھا اب بھی اپنے حقّے سے سرگوشیاں کر رہا ہے لیکن اس کے جھونپڑے سے دھواں نکلنا بند ہو گیا ہے۔ اسے کسی کا انتظار نہیں۔ لیکن اس کی نشست اس انداز کی ہے کہ کسی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ ایسے ہی ایک رات میں

اپنے کمرے کے لیمپ کی مدھم روشنی میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ میز کے کنارے رشاید میں اسی طرح بیٹھا تھا جیسے اب اس چبوترے پر بیٹھا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے کھلی ہوئی کتابیں تھیں۔ اور اب یہ کھلا ہوا بیگ ہے۔ تم بھائی جان اور آپی کے ساتھ سرکس دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ مجھے پتا تھا آدھی رات کو تمہارا دروازہ کھولنے کوئی نہیں اُٹھے گا اور اگر میں بھی سو جاتا تو تمہیں کس قدر تکلیف ہوتی۔ لیکن میں سوتا کیوں؟ مجھے معلوم تھا کہ جب تم میرے کمرے میں گذروگی تو سب سے پیچھے رہوگی۔ آپی اور بھائی جان کو موجودگی میں مجھ سے بات تو نہ ہو سکے گی۔ لیکن جاتے جاتے اپنی مخروطی انگلی سے میری گرم گرم گردن پر نشان بنا جاؤ گی۔ مجھے ایک پھریری سی آئے گی اور جب تم چلی جاؤ گی تو میں اپنے کالر کے نیچے اس برفیلی مچھلی سے کھیلنے کے لیے بار بار جھنجھنا اٹھوں گا اور پھر یہ رات اسی روہو سے بازی کرنے میں گزر جائے گی۔۔۔ لیکن اب تو مجھے اس مخروطی انگلی کے لمس کی تمنّا نہیں۔ اب تو مجھے برفیلی قاش کے تڑپنے کی امید نہیں۔ پھر میں اس چبوترے پر اسی انداز میں کیوں بیٹھا ہوں؟ شاید اچانک اسی طرح جس طرح پچھلے ہفتے دس روپے کا وہ نوٹ جو پھر پھرا کر میرے ہاتھ آ گیا جس کے ایک کونے پر میں نے تمہارے نام کے ہندسے لکھے تھے تم بھی آ جاؤ مگر ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم میری اس عادت پر کس قدر برہم ہوئی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تم نے کہا تھا۔ ''آپ دولت پر میرا نام لکھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔ کیوں کہ آپ امیر ہیں۔ میں سرمائے کی پجارن نہیں۔ جذبات کے مکتب کی پروردہ ہیں۔ ہمارے رابطے کو اتنا سستا تو نہ بیچیے۔'' اور جب میں یہ بات سن کر ذرا پشیمان ہو گیا تھا تو تمہی نے میری خفّت مٹانے کے لیے کتنے پیار سے کہا تھا۔ ''مجھے پتہ ہے آپ کا انوکھا اندازِ فکر کبھی آپ کو ایک افسانہ نگار بنا دے گا۔ اس وقت آپ کسی کی کتاب پر میرے نام کے ہندسوں کے بجائے اگر میرا نام لکھا ہوگا تو مجھے کتنی خوشی ہوگی۔''۔۔۔۔ لیکن میں افسانہ نگار نہ بن سکا اور تمہارے نام سے کسی کہانی کو نسبت نہ دی جا سکی اور اب تو وہ نوٹ بھی معدوم ہو چکے ہیں جن پر تمہارے نام کے ہندسے لکھے تھے۔ اس وقت نہ تم جذبات کے مکتب کی پروردہ ہو اور نہ میں اقتصادیات کا طالب علم۔ میں تو ایک مسافر ہوں جو تھوڑی دیر کے لیے یہاں آیا ہوں اور اس چبوترے پر بیٹھ کر جھومر ڈال کر گانے والے گھبروؤں کی بنکاریں اور ڈولی میں سوار کراتی ہوئی ہم جولیوں کے درد بھرے گیت سن رہا ہوں۔

میں پوچھتا ہوں، تم نے اتنے سارے وعدے جو کیے تھے وہ کیا ہوئے؟ وہ لمبے لمبے پروگرام ہو ہر روز مرتّب ہوتے تھے اب کس طرح پورے ہوسکیں گے۔ اگر کسی طرح کرنا تھا تو مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔ میرے پاس تمہاری کوئی نشانی نہیں اور میں صرف تمہاری یادوں کے سہارے اتنی لمبی عمر بسر نہیں کرسکتا۔ تمھاری یاد تازہ کرنے کے لیے بھی تو کسی آسرے کی ضرورت ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں تم میرے دماغ سے محو ہی نہ ہو جاؤ۔ غمِ روزگار بہت ہی دل فریب ہے۔ ہم تقسیم ملک کے بعد جو آج تک نہ مل سکے۔ اس میں سراسر میرا ہی قصور ہی تو تھا۔ میں آج تک اپنی زندگی برقرار رکھنے میں کوشاں رہا۔ اس دوران میں تمہاری یاد میرے ذہن سے بار بار آ کر ٹکراتی تو رہی مگر ایسے جیسے بارش کا کوئی چھینٹا کسی دیوار سے جا ٹکراتا ہے۔ تمہارا چہرہ تخیّل کی وادی میں لہراتا ضرور مگر میری بے پناہ غیر ضروری مصروفیتیں اس کے درمیان اندھا شیشہ بن بن گئیں۔ یہی نہیں۔ بعض اوقات میرا دل یوں بھی چاہا کہ میں اپنے دوستوں کی طرح کسی کے ساتھ سینما دیکھنے جاؤں، تحفے دوں اور ان سے نشانیاں وصول کروں۔ پیتل کی وہ انگوٹھی جو میں نے تم سے بڑی خوشامدوں کے بعد حاصل کی تھی تھوڑا عرصہ

ہوا ستلج میں کشتیاں دوڑاتے ہوئے گر گئی۔ میرا محبوب سیاہ کوٹ مشرقی پنجاب میں ہے۔ تمہارے نام کے ہندسوں والے نوٹ اب بند ہو گئے ہیں اور ستلج کا وہ حصّہ بھی اب ہمارے ملک میں نہیں رہا۔

جس دن تمہارا کنبہ ہمارے قصبہ کو چھوڑ کر جا رہا تھا اس دن مجھے پریشان دیکھ کر تمہی نے کہا تھا کہ۔ ''کوئی بات نہیں ایک ہی زمین پر ہیں۔'' لیکن چند سالوں کی بات ہے ایک دن جب میں شہر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو تم نے مضطرب ہو کر پوچھا تھا۔ ''ہمارے قصبے میں کالج نہیں کھل سکتا کیا؟'' ''کیوں'' میں نے پوچھا تھا تو تم نے جواب دیا کہ۔ ''ایک ہی بستی میں خواہ دُور دور رہیں پر ملنا آسان ہوتا ہے۔'' اب تمہی سے پوچھتا ہوں کہ میں کہاں بیٹھا ہوں؟ کیا یہ ایک بستی نہیں؟ کیا یہ ایک ہی زمین نہیں؟ اب کہو ملنا آسان ہے! گو ہم اتنا عرصہ دُور دُور رہے لیکن اس دوری کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ تم کوئی اور آغوش اختیار کرتیں۔ میں تو ہر گھڑی یہی سمجھتا رہا کہ اب بھی تمہیں اسی شدت سے یاد ہوں لیکن تم نے شاید ایسا نہیں جانا۔ اگر ایسا سمجھتیں تو اس طرح دھوکا نہ دیتیں۔

مشرقی پنجاب چھوڑنے کے بعد مجھے مدت تک تمھارے اقامت پذیر ہونے کا پتہ نہ چلا اور نہ میں تجسّس کر کے معلوم کر سکا۔ ان دنوں اپنی زندگی غیر معمولی طور پر پیاری ہو گئی تھی۔ تمہارا صرف اتنا پتا تھا کہ تم زندہ ہو اور کہیں آباد ہو۔ اسی ملک میں اسی زمین پر پنجاب کے کسی گوشہ میں۔ پرسوں اچانک تمہارے بھائی جان اچانک اسٹیشن پر مل گئے۔ وہ راولپنڈی اپنی نوکری پر واپس جا رہے تھے۔ انھوں مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ چونکہ چار دن سے زیادہ چھٹی نہ مل سکی تھی اس لیے وہ جلد واپس جا رہے تھے۔ اُنھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ اگلے ہفتے تمہارا سارا کنبہ ان کے پاس راولپنڈی چلا جائے گا۔ کیونکہ تمہیں رخصت کرنے کے بعد تمہارے ابّا اور امّی اس گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ آج میں یہاں بیٹھا ہوا یہی سوچ رہا ہوں کہ آج اور کل میں کتنا فرق ہے۔ کتنا بُعد ہے۔ کس قدر دوری۔ آج گاؤں میں مسّرت کے شادیانے بج رہے ہیں۔ کل خدا معلوم کیا ہو۔ آج تنوروں سے دھواں اس لیے اٹھ رہا ہے کہ زندگی کی حرارت برقرار ہے۔ کل شاید یہی دھواں اسی حرارت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بل کھانے لگے۔ آج یہ بوڑھا اس لیے انتظار کی گھڑیاں گن رہا ہے کہ قالبِ انسانی کی تذلیل نہ ہو۔ اور کل، آنے والی کل! پتہ نہیں کس وقت آئے اور کیسے آئے! یہاں پہنچ کر یہ پگڈنڈی ختم ہو جاتی ہے۔ ببول کے درخت خاموش ہیں۔ ڈیلیا میں موٹے موٹے خوناب پروئے ہوئے ہیں۔ یہ چبوترہ پہلے ایسا نہ ہوگا۔ اسے چننے والوں نے سیمنٹ اور ریت کو اپنے آنسوؤں سے گوندھا ہوگا۔ اس کی سطح پر اپنی پلکوں کی جھاڑو دی ہوگی اور یہاں اپنی سانسوں کے چراغ جلائے ہوں گے۔ لیکن اب یہ بالکل اکھڑ چکا ہے۔ اس کے پہلوؤں میں چیونٹیوں نے بل بنا لیے ہیں اور مسلسل بارش نے اس کی تنویروں کو بھو بھلا دیا ہے۔ میں نے کہا نا کہ غمِ روزگار واقعی بہت دلفریب ہے۔ میں بھی یہاں پہلی اور آخری مرتبہ آیا ہوں۔ کشمکشِ حیات بار بار رخصت نہیں دیتی۔ یہ تمہارا گاؤں ہے۔ یہ تمہارا قصبہ ہے۔ یہی تمہارا شہر ہے۔ لیکن میں اس کے کونج پر تمہارے مسکن سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوں۔ میرا یہاں کوئی بھی واقف نہیں۔ سوائے تمہارے اور تم انجان بنی بیٹھی ہو۔ صرف یہ شادیوں کے ترانے مانوس معلوم ہوتے ہیں۔ جو ہر شادی پر بجا کرتے ہیں۔ شاید ان کی آواز تم بھی سن رہی ہو۔ لیکن اب تم کچھ بھی نہیں سن کر سکتی ہو میں بھی ان کے بول سمجھ رہا ہوں۔ پر اب مجبور ہوں۔ پہلے تمہاری بے رخی سے شکوہ تھا۔ اب نہیں رہا۔ اب ہم دونوں ایک سے ہیں۔ مجھ سے اپنی یاد میں حشر کے دن تباہ کرنے کی توقع نہ رکھنا۔ میں تمہارے بعد اپنی

زندگی بہلانے کے لیے طرح طرح کے کھلونے خریدتا پھرتا ہوں۔اور یہاں بھی اسی کی خوشنودی حاصل کرنے چلا آیا تھا۔شاید سی کو خوش کرنے کے لیے میں نے تم سے پیار کیا تھا۔اب اسی کو مسرور کرنے کے لیے تمہاری بے التفاتی کا نظارہ کرنے آیا ہوں۔ابھی ابھی اس بوڑھے کی بیوی پیتل کی گاگر پانی سے بھر کر لائی تھی۔میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور بیگ کو دیکھ کر بولی۔''کس قبر پر پانی چھڑکوں؟ مسافر؟''میں نے جواب دیا۔''یہیں اسی جگہ، جہاں یہ پگڈنڈی ختم ہوتی ہے۔جہاں سے ڈیلیا اور کریر کی جھاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔''وہ حیرت سے دیکھنے لگی اور میں نے جیب سے چونی نکال کر کہا۔''ہاں! ہاں! یہیں اسی جگہ انڈیل دو۔اسی راہگذر پر یہیں کہیں اسی وادی میں اس کا مدفن ہے۔''وہ اسی راہ پر پانی انڈیل کر چلی گئی ہے۔بہت سے چیونٹے جن کے گھروں میں پانی گھس گیا تھا۔ادھر اُدھر بھاگے پھرتے ہیں۔کتنے ہی بلبلے جو پانی کی سطح پر تھرکنے لگے تھے کانپ کانپ کر پھوٹ گئے ہیں۔وہ سوندھی سوندھی خوشبو جو مٹی اور پانی کی ہم آغوشی سے پیدا ہوئی تھی اب مت چکی ہے۔پانی جذب ہوتا جا رہا ہے۔یہ کھیل بھی ختم ہوا۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔یہ رات بہت لمبی ہے۔یہ سفر بہت لمبا ہے۔اور یہ زندگی تو بہت ہی لمبی ہے اور ہاں نرگس کے چند پھول تمہارے لیے لایا تھا۔بسنتی سویٹر کے زرد زرد بٹن۔انہیں بھی اسی سیلی زمین پر چھوڑے جاتا ہوں۔یہ رات بہت تاریک ہے۔یہ گاؤں میرے لیے اجنبی ہے۔آج رات کہر کے آثار نمایاں ہیں اور مجھے بہت دُور کا سفر درپیش ہے۔اچھا!۔۔۔اچھا!

شب خون

''ہائے اللہ! شقو بھائی مر جائیں گے تو کیا ہوگا!'' منی نے اپنے سینڈل کا تسمہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ جلا دینے والی گرمی میں پیدل سکول سے ہی آئی تھی اور پسینہ میں نہا رہی تھی۔ منہ سے لمبی لمبی پھونکیں چھوڑ کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر اچانک اسے شقو بھائی یاد آ گئے ۔ ہائی چین کی کتاب میں لکھا تھا کہ گرمی میں دِق کے مریضوں کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ پتہ نہیں اب بیچارے شقو بھائی کس حالت میں ہوں گے۔ اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ غنودگی سے ان کی آنکھیں بند ہو ہو جاتیں اور اخبار کو تھامے ہوئے ڈھیلے ہو کر منہ کی طرف لپکتے ۔ اخبار سرسراتا اور وہ ایک دم آنکھیں کھال کر چوکس ہو جاتیں۔ اس جھد و جہد میں انھوں نے منی کا فقرہ مشکل سے سنا مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ شقو کو آج سے دو سال پہلے رد چکی تھیں اور اس کے لیے وہ اتنے آنسو بہا چکی تھیں کہ اب ان کی آنکھوں میں پانی میں نہ رہا تھا۔ جب وہ اکثر اپنی خاندانی غیر معمولی بصارت کا تذکرہ کرتیں تو شقو کا ذکر ضرور آ جاتا جس نے انہیں عینک پہننے پر مجبور کر دیا تھا۔ شقو کی بیماری نے انھیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ نہ دنیا کا نہ دین کا! چھ ماہ تک تو یہ بیماری ایسی چھپی رہی جیسے کسی نوجوان لڑکی کے سینے میں گمنام سی آہ مگر اس کے بعد ایک دم اُجاگر ہو گئی۔ پھیپھڑوں کی دھونکنی سے بوسیدہ کپڑوں کے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں اور سانس کی نالی میں سڑے بسے بساندھ کے مارے حقے گڑگڑانے لگے۔ چچی جیناں نے دو تعویز دیے۔ ایک تو مریض کے بازو سے باندھ دیا اور دوسرے پر صبح صبح چٹاخ پٹاخ سات جوتے پڑتے اور پھر ریشم کی ایک تھیلی میں جہاں کافور اعرمشک کے ذرے مہکتے اور گوٹے اور ورق کی کرنیں جھلملاتیں ڈال دیا جاتا اور سب سے اونچی کھونٹی پر یوں لٹکایا جاتا کہ کسی ذی روح کا سایہ نہ پڑے۔ چھپکلیاں تو خیر شہتیروں کے بیچوں بیچ چلتی ہیں ۔ لیکن پھلواڑی سے آئی ہوئی تتلیاں اور شہد کی مکھیاں البتہ اس کے گرد منڈلاتیں لیکن ان کا سایہ نہیں ہوتا۔'' ۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنے ابلق گھوڑے سے اتر کر۔ اس نے کنوتیاں جوڑیں۔ شس شس کرتی دم کو جھٹکا اور پچھلی ٹانگ زور سے جھاڑی۔ دور سانی کرتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر اس نے اپنے نتھنے پھلائے اور ایسے ہنکنے لگا جیسے ہارمونیم کے موٹے سروں پر چھپھلتی ہوئی انگلیاں ڈگمگا رہی ہوں۔ میں اسے زہریلے کانٹوں والی جھاڑیوں اور الجھیلے سرکنڈوں پر سے بھگا تا لے گیا تھا اور دوڑاتا لایا تھا۔ اس کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان پھین کا ایک چھتہ لٹک رہا تھا اور اگلی گامچیوں سے خون بہنے لگا تھا۔ گھوڑے نے ایک نظر میری دیکھا اور اگلی لگام جھٹک کر آزاد ہو جانے کی درخواست کی۔ شاید اس نے اپنی طرف بڑھتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر ایسے کیا تھا۔ میں نے اس کی کمر تھپتھپائی اور میرا ہاتھ گرم پسینے اور سنہری سنہری لوئیں سے شربتی ہو گیا۔ اس سے گھوڑے کی سخت جانی اور تنومندی کی بو آتی تھی۔

''لائیے۔'' اس نے میرے قریب آ کر کہا اور میں نے باگ اس کے ہاتھ میں دے دی۔ گھوڑے نے ایک قدم اٹھایا۔ مگر وہ لڑکی وہاں سے ہلی نہیں۔ یونہی کھڑی رہی، خاموش اور بے جان۔ اس کی دھوئی دھائی بے نور آنکھوں میں نرگس کے مرجھائے ہوئے پھول سرنگوں تھے۔ سرمے کی موٹی موٹی تحریر باہر کے سیاہ حلقوں سے مل کر بہت بھیانک ہو گئی تھی۔ خون کی کمی سے چہرہ مچھلی کے گوشت کی طرح پھیکا سا دکھائی دیتا تھا اور مساموں سے زہریلے سوتے پھوٹ رہے تھے اس کی سانس گرم تھی مگر مانوس! چہرے پر پسینے کے قطرے تھے مگر ٹھنڈے اور بے مہک ہونٹ چھال کا رنگ پکڑنے سے عاری تھے اور سفید منجھے ہوئے دانتوں میں زندگی کی ایک بھی کرن نہ تھی۔ اس کے

بال جو کبھی بہت سیاہ ہوں گے بھٹوں کے جھونٹوں کی طرح دھونسے ہوئے تھے۔ گہرے پیلے رنگ کی قمیض نے جس سے دیسی صابن کی بو آرہی تھی اسے زندگی کی لپیٹ سے بہت دُور کھینچ لیا تھا اور اب وہ زندگی اور موت کے درمیان ایک بھیگی ہوئی بھر کی طرح سمٹی ہوئی تھی۔ خاموشاور بے جان! میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے باگ چھوڑ دی اور لرزنے لگی۔ گھوڑا ٹاپیں مارتا دانے کی طرف لپکا اور وہ ڈگمگا کر مجھسے لگ گئی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر منہ رکھ دیا۔ وہ اتنے ٹھنڈے تھے کہ میں نے اپنے لبوں کو ہٹالینا چاہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں پھڑ پھڑاتی ہوئی مجروح التجا دیکھ کر انھیں اٹھایا نہیں بلکہ دبا دیا اور زور سے اور شدت سے۔ ذرا سی دیر کو اس کے لبوں میں حرارت پیدا ہوئی جیسے بجھتی ہوئی بیٹری کا بلب اونگھتا ہوا آنکھ کھولتا ہے۔ اور پھر سو جاتا ہے۔ جاتی دفعہ اس نے اپنے پپوٹے جھپکے مگر بجلی نہ چمکی۔ اُس نے اپنے انگ انگ کو جھلایا مگر مسکا نہ سکے۔۔۔۔۔'' نسیم نے شقو کا یہ خط جیب میں رکھ لیا اور اپنے کمرے کو مقفل کر کے چابیوں کی زنجیر انگلی پر گھماتا ہوا باہر نکل گیا۔

بیٹرس نے گریبان سے پین نکالا اور چارٹ بھرنے لگی۔ ''رات کتنی مرتبہ خون تھوکا؟''

''یہی کوئی بیس پچیس مرتبہ۔''

''پروگریسنگ!'' اُس نے مسکرا کر نیلی شیشی کے منہ سے تھرمامیٹر نکالا اور شیشے کی صراحی سے اس پر پانی گرا کر ایک دفعہ جھٹکا۔ شقو پہلے ہی سے منہ کھولے لیٹا تھا۔ تھرمامیٹر زبان سے چھوا اور اس نے ہونٹ بند کر لیے۔ بیٹرس چارٹ پر کچھ دیر لکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی کلائی پر بندھی منی سی گھڑی کو دیکھا اور تھرمامیٹر اس کے منہ سے نکال کر پھر اسی نیلی شیشی میں ڈال دیا۔

''پروگریسنگ۔'' اس نے ایک دفعہ پھر کہا اور چارٹ دیوار سے لٹکا دیا۔

''ہر روز پروگریسنگ۔'' شقو نے مسکرا کر کہا۔'' بیٹرس تمہارے ایسا خوش فہم بھی شاید ہی کوئی ہو۔''

''خوش فہم۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔''تم ترقی کر رہے ہو۔ یہ چارٹ دیکھو۔''

اس نے چارٹ اتار کر کہا۔'' یہ لائن کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ دیکھو! دیکھو!'' بیٹرس نے چارٹ اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہا مگر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مسکرانے لگا۔

''تم بڑے شریر ہو۔'' بیٹرس نے چارٹ کا کونہ اس کی ناک سے چھوا کر کہا اور پھر یہ کہہ کر کہ وہ بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ آگے چلی گئی۔ یہ سن کر شقو مسکرانے لگا اور دیر تک مسکراتا رہا۔

گرمیوں کی شدید گرم اور چاندنی راتوں میں اکثر خالد اپنی جرسی کے بٹن کھولے مونجھ کی نمدار چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ کر سوچنے لگتا کہ ''اوپر چچا'' مر جائیں گے تو اچھا ہوگا یا برا۔ چاچا نے اسے اپنے کندھوں پر بیٹھا کر اتنا بڑا کیا تھا۔ اس کی پیدائش سے لے کر اپنی بیماری شروع ہونے تک وہ اس کے ساتھ یوں چمٹے رہے گویا یہ وابستگی ہمیشہ رہے گی۔ خالد کو اپنے چچا کا گول مول اور گھنی مونچھوں والا چہرہ یاد آ گیا جس کے دائیں گال کی ہڈی پر ایک نشان تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ گہرے زخم کا چاند سا نشان! خالد کا دل رونے کو چاہتا تھا مگر گرمی کی زیادتی اور کھلی ہوئی چاندنی کی بہار اسے رونے نہ دیتی۔ اوپر چچا اس کے لیے کتنے اچھے اچھے کھلونے لاتے تھے۔ چوں چوں

کرنے والا مرغ، سیٹی بجانے والا انجن اور سلام کرنے والا فوجی۔ پھر وہ ذرا بڑا ہوا تو نیلی پیلی رنگ برنگی تصویروں والی کتابیں لانے لگے۔اس کے امّی کی آکھ بچا کر میٹھی گولیاں اور آم پاپڑ بھی لا دیتے تھے۔ کتنے اچھے تھے چاچا۔ جب کوئی اسے مارتا تو وہ اسے مرغی کی طرح گود میں چھپا لیتے۔ بابا جی کہتے تھے، اس طرح وہ خالد کی عادتیں بگاڑ دے گا۔ وہ ضدّی اور چنچل ہوتا جاتا تھا اور ہر بات منوانے کے لیے زمین پر لیٹنے لگتا تھا اور ندیدوں کی طرح ہر کھانے والے کی طرف گھورتا رہتا تھا۔ خالد کو یہ الفاظ یاد آئے تو وہ بہت کھسیانا ہوا۔ بچپن میں اس کا رویہ واقعی اس قسم کا تھا اور بڑے ہو کر بھی وہ بہت ممکن ہے ایسے ہی رہتا اگر اُپر چچا کو دق نہ ہو جاتی۔۔۔۔۔۔۔اس لحاظ سے تو اُپر چچا کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ یہ سوچ کر وہ ذرا سا کانپا اور پھر اپنی ٹانگیں ہلانے لگا۔ سردیوں وہ رات جب بادل اُمڈ گھومڈ کر آئے تھے اور شام ہی سے موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی اب خالد کو یاد آ رہی تھی۔ آتشدان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ بجلی کا مین فیوز اڑ چکا تھا اور اب صرف انہی لکڑیوں کی نارنجی روشنی سامنے کی دیوار پر جھومر کی طرح جگمگا رہی تھی۔ روشندانوں کے شیشوں سے چمٹا ہو بھیانک اندھیرا اندر جھانک رہا تھا۔ باہر زفیل دیتی ہوئی ہوا اب چنگھاڑنے لگی تھی۔ اور دوسرے کونے میں ٹڈی خوف سے ٹرائے جاتی تھی۔ خالد اُپر چچا کے ساتھ بستر میں لیٹا ہوا تھا کہ انہیں اچانک ایک شرارت سوجھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور سانس روک کر کہنے لگے۔ ''لو بھئی خالد ہم تو مر گئے۔''

خالد رونے لگا پر وہ اسی طرح دم کشی کیے لیٹے رہے۔ اس کی سسکیاں آہوں میں اور پھر چیخوں میں بدل گئیں مگر وہ نہیں مانے۔ جب وہ رونے سے زندہ نہیں ہوئے تو خالد خاموش ہو گیا اور خود بھی یہ کہہ کر کہ ''اُپر چچا ہم بھی مرتے ہیں۔'' آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

''ایسے نہیں بکا کرتے۔'' انہوں نے ایک دم آنکھیں کھول کر کہا۔

''تو آپ کیوں بکتے تھے؟''

''میں تو تمہارا چچا ہوں۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔میں تو۔۔۔۔۔۔۔میں تو۔۔۔۔۔۔بڑوں کی نقل نہیں اتارا کرتے، اچھا!'' وہ تو خیر جھوٹ موٹ کی بات تھی پر اب اُپر چچا واقعی مر رہے تھے۔ اور انہیں کوئی رونے والا نہ تھا۔ خالد نے کروٹ بدلی اور اپنے ابی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ابی! ابی!!'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''سو گئے ابی؟''

''نہیں!'' اس کے ابی نے غنودگی میں جواب دیا۔ ''کیوں کیا بات ہے؟''

''ابی میں کل ہاسپٹل جاؤں گا۔ اُپر چاچا سے ملنے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''پاگل ہوا ہے!'' اس کے ابی نے جھڑک کر کہا۔ ''اس سے تو بہتر ہے کچھ کھا کر سو رہ۔''

''کیوں ابی؟'' خالد نے منہ بسور کر پوچھا۔

''ارے اُلّو۔ کوئی صحت مند ٹی۔ بی کے وارڈ میں بھی جاتا ہے؟''

''جاتے تو ہیں، ڈاکٹر لوگ جاتے ہیں۔ دوائی پلانے والی نرسیں ہوتی ہیں۔ بھنگی اور سقّے۔۔۔۔۔۔''

''وہ تو ان کا فرض ہے کہ۔۔۔۔۔''

''اور فرض کروابی یہ میرا بھی فرض ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔''

''گدھا کہیں کا۔۔۔۔۔۔فرض کیا کیا؟ یہ بھی کوئی الجبرے کا سوال ہے!''

''پرابی۔''

''ضدّ نہیں کیا نہیں کرتے بیٹے۔اپنے چچا کی صحت کے لیے یہیں سے دعا کرو۔''

''کیا دعا کروں ابی؟''

''یہی کہ خدا ان کے دن آرام سے بتادے۔''

''اور خدا انہیں صحت دے۔''

''ہاں یہ بھی۔۔۔۔۔۔۔مگر۔''

''مگر کیا ابی؟''

''لیکن اگر اللہ میاں چاہیں تو؟''

''ہاں پھر تو ہوسکتی ہے۔مگر اللہ میاں چاہتے نہیں۔''''چاہتے کیوں نہیں ابی؟''

''سو رہو!''

''ابی،اللہ میاں۔۔۔۔۔۔!''

''سو رہو!''

''ابی جی،اللہ میاں جی۔''

''سو رہو!''

خالد خاموش ہوگیا۔مگر سویا نہیں۔

''تمہارے نتھنے بڑے خوبصورت ہیں۔''بیٹرس نے شقو کی ناک چھو کر کہا۔

''ہاں اچھے تھے پر اب نہیں۔''

''اب کیوں نہیں۔۔۔۔۔دیکھو جب تم سانس لیتے ہو تو یہ نوزائیدہ بچے کی ہتھیلوں کی طرح گلابی ہوجاتے ہیں۔''

''مگر تمہارے جیسی خوبصورت ناک میں نے کسی اور کی نہیں دیکھی۔۔۔۔۔یہ رومن نوز ہے؟''شقو نے سوال کیا۔

''ہاں۔''بیٹرس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر مسکرا کر نیچے دیکھنے لگی۔

''تمہارے بازو کس قدر خوب صورت اور مضبوط ہیں۔یہ آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی خون بار شریانیں۔میرا دل چاہتا ہے ان سے خون چوس لوں۔''

''چوس لو۔'' بیٹرس نے بازو آگے بڑھا کر کہا۔

''نہیں ایسے نہیں۔ کسی دن چھاپہ ماروں گا۔''

بیٹرس ہنسنے لگی۔ شقو نے اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھ دیا اور بولا۔ ''تم نے یہ تازگی کہاں سے پائی؟ یہ زندگی، یہ شباب اور اتنی رعنائی۔ تم نے کبھی الفانسو کھایا ہے؟ تمھارے ہونٹ اس کی قاشیں ہیں۔ کاش مس نورا بھی تمھاری طرح اپنے ہونٹوں کو لپ اسٹک سے پاک رکھتیں ۔۔۔۔۔ تمھاری سیاہ اور عمیق آنکھیں جو اندھیرے میں اجالے کے سانس لے رہی ہیں اور تمھارے بال گھنے اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ لیکن میں نے تمھارے بالوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ تم اسکارف پہنے آتی ہو اور ایسے ہی چلے جاتی ہو۔'' بیٹرس نے رومال اپنے سر سے اتار دیا اور اس کے طلائی بالا یک دم کھل پڑے۔ ''خوب۔ خوب!! چمک اور آب کی انتہا ہے اسے پھر سکارف میں چھپا لو۔'' شقو نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میری سانس مسموم ہے کہیں یہ سنہری سپنے سنولا نہ ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ بیٹرس تم اتنا حسن اور اتنی زندگی کا کیا کرو گی بہت سے محتاج تمھاری طرف نگاہیں لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھو، میں تم سے یہ سب چیزیں نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی اور لمبی عمر، خوبصورتی اور توانائی کی ضرورت نہیں مگر میری یہ تمنا ہے اگر تم مجھے ایک دن کے لیے اپنا یہ روپ اور جوانی دے سکو تو میں اسے مل آوں۔ میرا دل اسے دیکھنے کو بے قرار ہے۔''

''میں ضرور دیتی اگر میں دے سکتی۔'' اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور وہ فرش کی جانب دیکھنے لگی۔

''تمھاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟ دیکھو مجھے آنسو بہت اچھے لگتے ہیں۔ جھلملاتے ہوئے ننھے منے چراغ۔۔۔۔۔ اندھیرے کے سسکتے ہوئے جگنو۔ مگر مجھے ان سے ڈر بھی لگتا ہے۔ جب یہ آنکھوں سے نکل کر پلکوں پر کانپنے لگتے ہیں تو میرا دل لرزنے لگتا ہے۔ انہیں آنکھوں سے نکلنے سے پہلے ہی پونچھ ڈالو۔ میں جھلملاتے آنسو دیکھ کر مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو دق کی ہی موت پسند ہے۔۔۔۔۔ مجھے پتہ ہے تم کیوں روئی ہو۔ میری جانِ تمّنا کا نام سن کر تمہیں کیپٹن عبّاس یاد آ گیا نا؟۔۔۔۔۔''

''زیادہ باتیں نہ کرو۔'' بیٹرس نے کہا۔ ''سسٹر خفا ہو گی۔۔۔ اب سونے کی کوشش کرو۔ لاؤ میں تمھارا سینہ سہلا دوں۔'' بیٹرس نے آہستہ سے اس کا گریبان کھولا اور بالوں بھری چھاتی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شقو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گیا۔ بیٹرس نے دیکھا، اس کی آنکھیں اب پہلے زیادہ اندر دھنس گئی تھیں۔ کنواں روز بروز سوکھتا چلا جا رہا تھا اور اس کے کنارے بھیانک اور گھناؤنے ہوتے جا رہے تھے۔ ہونٹوں کی سرخی اب ختم ہو گئی تھی۔ اور کلّوں کی ہڈیاں اب دریا کی ریتی کی طرح اُبھر آئی تھیں۔ بیٹرس کو عشق عبّاس سے ہی ہوا لیکن پیار سب سے زیادہ شقو پر آیا۔ اگر شقو صحت یاب ہو جائے اس نے سوچا تو کتنا اچھا ہو۔ میں اسے کبھی گھر واپس نہ جانے دوں۔ وہ لوگ تو نا امید ہو ہی چکے ہیں اور انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر ہوتی تو سالمی میں کئی بیڈ خالی تھے۔ کوئی ریزرو کروا لیا ہوتا۔۔۔ شقو عمر بھر میرے پاس رہے۔ بچوں کی طرح ہر روز مجھ سے پوچھے۔ ''یہ ناک رومن ہے نا؟'' فلسفیوں کی طرح میرے سامنے بیٹھ کر کہے۔ ''اپنے آنسو پونچھو، بیٹرس، وہ پلکوں تک پہنچا چاہتے ہیں۔'' اور شاعروں کی طرح میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہے۔ ''بیٹرس، مجھے تم سے محبت نہیں مگر میرا دل چاہتا ہے تمھارے لیے ایسے ملکوتی گانے لکھوں جو پلکوں کی طرح تاب ناک اور نوجوان بوسوں کی طرح خوش بو دار اور گداز

ہوں۔۔۔۔۔مگر دق کے مریض! وہ تو صحت یاب نہیں ہو سکتے لیکن اگر خدا چاہے تو۔۔۔۔۔پر خُدا نہیں چاہتا۔"

"خدا کی پناہ۔" سسٹر نے آ کر کہا۔"بیٹرس یہ تمہارے پاٹ پر فیئر نہیں۔ایک پیشنٹ پر اتنا وقت لگا دیا۔اَن فیئر۔اَن جسٹ۔پلیز میک ہیسٹ۔"

شقو نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔"میم صاحب آپ کو باتیں بنانے کے سوا اور بھی کچھ آتا ہے؟ ین فیئر۔ین جسٹ۔اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ایک ہی سانس میں چھوڑے جاتی ہیں۔"

"او پیشنٹ تھرٹی ون!" سسٹر نے مسکرا کر کہا۔"نیوروٹک ہو گیا ہے۔نیوروٹک۔۔۔۔۔۔اسے ٹین گریم پوٹاسم برومائیڈ دے دو ،ابھی اسی وقت۔"

جب وہ چلی گئی تو شقو نے کہا۔"لاؤ مجھے پوٹاسیم برومائیڈ پلاؤ، بیٹرس۔" تو وہ رونکھی ہو گئی۔" سسٹر تو پاگل ہے۔" اس نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ نرس تم پر بہت مہربان ہے۔" مسٹر بھومکا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ہوں۔" شقو نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"اس کی باڈی کا کٹ دیکھا۔" مسٹر بھومکا نے اسے پھر متوجہ کیا۔"میری منجھلی سالی سے بہت کچھ ملتی ہے۔ویسی بیک، وہی سینہا ور رانیں تو ایک دم وہی۔۔۔۔۔یہ اگر مدراس مین ہوتی تو میں اس سے ضرور شادی کرتا۔" پھر وہ خاموش ہو گیا اور شقو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"مسٹر بھومکا۔" شقو نے منہ پھیر کر کہا۔"ٹی بی کے مریضوں میں باتیں کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ٹی بی وارڈ کی مجلس کا پہلا اصول ہی یہی ہے کہ ایک مریض بات کیے جاتا ہے۔اور دوسرے سنے جاتے ہیں۔جب وہ تھک جاتا ہے تو دوسرا شروع کر دیتا ہے۔سوال جواب پھیپھڑوں کے بل بوتے پر ہوتے ہیں اور ہمارے پھیپھڑے تو تم جانتے ہو دھنکے جا چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" مسٹر بھومکا نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔"میرا ایک پھیپھڑا تو بالکل شیٹر ہو چکا ہے اور دوسرا بھی ہوا ہے۔اس پر بھی مجھے امید ہے کہ میں ان گرمیوں میں نہیں مروں گا اور اگر میں مدراس میں ہوتا تو بہت سی گرمیاں کاٹ لیتا۔ادھر پنجاب میں گرمی بہت عجیب قسم کی ہوتی ہے۔گرمی مدراس میں بھی ہے۔مگر وہ بڑی لولی (lovely) گرمی ہوتی ہے۔ادھر لوگ پریم کرتا ہے۔موپلوں سے دوستی گانٹھتا ہے اور وہیل مچھلی کے تیل کی مالش کرتا ہے۔پنجابی لڑکی بہت کولڈ ہے۔ہماری طرف تو لڑکیاں بہت جلد ییلڈ (yeild) کر جاتی ہیں۔ہماری طرف پریم کی گرمی زیادہ ہے۔"

سپورن سنگھ نے کراہتے ہوئے اگالدان میں تھوک کر کہا۔"ہم تو آٹھ مہینے وہاں رہے۔"

پر کوئی نہ ملی کنواری نہ شادی شدہ۔آتی دفعہ ایک کول لڑکی ملی تھی۔زیادہ خوب صورت تو نہ تھی مگر اس کا جسم بہت اچھا تھا۔ہم ٹھہرے فوجی۔اُسے تین روپے تو کیا دینے تھے۔اُلٹے اُس کی چولی سے چھ آنے نکال لیے۔شاید اسی پاپ کے بدلے یہاں پڑا ہوں۔واہگورو کرپا

کرے تو اس کی تلاش کر کے تین روپے چھ آنے دے کر آؤں مگر وا ہگورو۔۔۔۔۔"

کامریڈ اصغر مسکرانے لگا۔

"ہاں! ہاں!"! مسٹر بھومکا نے کہا۔"کول لڑکیاں بہت خوب صورت ہوتی ہیں مگر ان کے جسم اچھے نہیں ہوتے۔ پر وہ کول لڑکیاں جن کی مائیں دراوڑ ہوتی ہیں جسم کی نہایت اچھی ہوتی ہیں۔ وہ لڑکی بھی کول دراوڑ ہوگی۔"

"شاید" کہہ کر سپورن سنگھ کھانسنے لگا اور تھوکتا اپنے بیڈ پر لٹک گیا۔ سامنے دروازے سے بیٹرس نکلی اور دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی۔"دیکھا۔" مسٹر بھومکا نے پھر کہا۔"اس کے جسم کا کٹ کتنا اچھا ہے۔ بالکل رانی جیسا۔ میری منجھلی سالی کا نام رانی ہے۔ اس کا کٹ بھی اس سے ملتا ہے۔ وہی بیک وہی سینہ۔۔۔۔"

"مسٹر بھومکا۔" شقو نے آنکھیں میچ کر کہا۔"اس کے کٹ سے ہمیں کیا فائدہ اور رانی کی بیک سے تمہیں کیا حاصل؟ یہ بتاؤ جب تم مر جاؤ گے تو تمہیں کوئی روئے گا بھی کہ نہیں؟"

"خدا" کامریڈ اصغر نے مسکرا کر کہا۔

"روئے گا کیوں نہیں؟" مسٹر بھومکا نے شرمندہ ہو کر کہا۔"سبھی روئے گا۔ ہماری فیملی، ہمارا خاندان ہر ایک روئے گا۔ مگر میں ابھی نہیں مروں گا۔ یہ گرمیاں اور اس سے اگلی گرمیاں پھر اس سے اگلی گرمیاں اور ممکن ہے اس وقت تک کوئی اچھا ٹریٹ منٹ نکل آئے۔"

"ٹی بی کا علاج تو خدا کے پاس بھی نہیں۔" کامریڈ اصغر کے پہلو سے آواز آئی اور اصغر بھی خوش ہو گیا۔"خوب بہت خوب"

سپورن سنگھ سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنا منہ پونچھ کر قریب لیٹے ہوئے ہم نفس کی طرف دیکھا جو مر رہا تھا، اتنی خاموشی سے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

"بھئی مجھے تو میرا بابا پو روئے گا۔" سپون سنگھ نے لبوں پر زبان پھر کر کہا۔

"یا ندھان سنگھ کھاتی کی لڑکی۔ مگر وہ سب کے سامنے نہیں روئے گی۔۔۔ اکیلی ہر ایک سے نظر بچا کر۔۔۔ اور۔۔۔ اور تو کوئی نہیں۔"

"گویا کل دو ہوئے۔" شقو نے حیران ہو کر کہا۔"مگر مجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔ میں نے کسی ندھان سنگھ کی لڑکی سے محبت نہیں کی۔ میری ایک خالہ جہلم رہتی ہے۔ اس سے بہت کچھ امید تھی۔ مگر آج کل اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں اور میں ان گرمیوں میں مر جاؤں گا۔ دوسری خالہ کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہے۔ کہتے ہیں رونے سے دودھ سوکھ جاتا ہے۔ اپنے بچے کو کون بھوکوں مارے؟ اور میری ماں؟ وہ تو مجھے آج سے بہت پہلے رو چکی ہے۔ جب میں جرمنوں کا قیدی بن کر گیا اور متوفی مشہور ہوا تو میری ماں بہت روئی اور اپنی آنکھیں گنوا بیٹھی۔ اب اس کے پاس رونے کو کچھ بھی نہیں، نہ آنسو نہ آنکھیں! ہاں ایک لڑکی ہے۔ میں نے شب برات کو اس کی پیشانی چومی تھی۔ پر وہ کیوں روئے گی۔ وہ بوسہ تو اس کے ماتھے میں جذب ہو کر معدوم ہو چکا۔ میری بڑی بہن کا خاوند انگلینڈ گیا ہے اور وہاں میموں سے عشق کرتا ہے۔ وہ مجھے روئے گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ اپنے خاوند کو یاد کر کے رو رہی ہے جس کی بہت سی بچیاں اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی

ہیں۔کاش کوئی مہندی لگا ہاتھ میرا ماتم کرتا۔'' شقو تھک کر خاموش ہو گیا۔

''کاش خدا کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوتا اور اس کے ہاتھ حنا آلود ہوتے'' کامریڈ اصغر نے کہا۔'' کیوں کہ وہی ہیں روئے گا اور وہی مالک روزِ جزا کا اور رب ہے۔سارے عالموں کا۔''

''تم ہر بات میں خدا کو کیوں کھینچ لاتے ہو''۔صوفی ابراہیم نے کہا۔''اس کے قہر سے ڈرو۔''

کامریڈ ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔پھر اس کے منہ سے خون کے چلوّ بہنے لگے اور وہ پٹی سے چپک گیا۔

''اچھا یہ بتاؤ یہ کامریڈ کب مرے گا۔''مسٹر بھومکا نے سوال کیا۔

''بہت جلد''سپون سنگھ نے تسلی آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

''نہیں یہ گرمیاں گذار لے گا۔''شقو نے اس کے چہرے کو بغور دیکھ کر کہا۔

''غلط بالکل غلط۔''مسٹر بھومکا نے کہا۔''سبھی اس دفعہ مر جائیں گے۔۔۔۔لیکن میرا ایک پھیپھڑا ابھی تک بالکل ٹھیک ہے۔''

''اچھا دیکھ لیں گے۔''سپون سنگھ نے کہا۔اس کس دل مونچھ مروڑنے کو چاہتا تھا تا کہ اس کے دعوے کی تصدیق ہو جائے۔پھر اس نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے مریض کو دیکھا۔

''یہ تو مر گیا بھئی۔''

''کون؟''شقو نے پوچھا۔

''یہ ٹونٹی تھری۔''

''ابھی نہیں۔''ٹونٹی تھری نے آنکھیں کھول کر کہا۔

''معاف کرنا۔''سپون سنگھ نے کہا۔''میں نے تمہارا دل دکھایا۔''

''کوئی بات نہیں۔''ٹونٹی تھری نے جواب دیا۔''دل کی خیر ہے۔میرا پھیپھڑا شدت سے دکھ رہا ہے۔''پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''ایک موٹا سا آدمی تمھیں ملنے آیا ہے۔''بیٹرس نے شقو سے کہا۔

''کیا نام ہے؟''شقو نے پوچھا۔

''سعید خان۔''

''وہ تو میرا ماموں ہے۔''شقو نے فخریہ کہا۔

''لیکن وہ تو بہت موٹا ہے۔''بیٹرس نے متحیر ہو کر کہا

''پہلے میں بھی موٹا تھا۔اس ٹی بی نے مجھے لاغر کر دیا۔''

''تمہیں ٹی بی نہیں۔''بیٹرس نے منہ پکا کر کے کہا۔''یہ شدید کمزوری ہے۔''

مسٹر بھومکا ہنسنے لگا۔

''لیکن بیٹرس۔۔۔۔۔''

''کیا حال ہے شقو میاں۔'' سعید ماماوں نے سانس روک کر پوچھا اور سنگتروں کا لفافہ جو وہ کولڈ سٹوریج سے لایا تھا اس کی پائنتی پر رکھ دیا۔

''اچھا ہے، کوئی تکلیف نہیں۔ امید ہے اس دفعہ چلا چلی ہو ہی جائے گی۔ شقو ہنسا۔

''نا بھئی ایسے نہ کہو، شاید۔۔۔۔۔۔''

''شاید ٹی بی کی ڈکشنری میں نہیں ہوتا۔'' کامریڈ نے وثوق سے کہا۔

''کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔'' سعید ماموں نے بٹوا جیب سے نکال کر کہا۔ ''اب تو میرے پاس ہیں پھر شاید ختم ہو جاہیں۔۔۔۔۔ یہاں آئیل انجن خریدنے آیا تھا۔ لکڑی کا بیوپار تو اب تقریباً بند ہی سمجھو۔ جنگ رک گئی۔ ٹھیکیداری ختم ہو گئی۔ ملتان میں برف کا کارخانہ لگانے کا ارادہ ہے۔ ہر روز ہزار من برف بنے گی۔ دوسرے کارخانوں میں تو یہی چار پانچ سو من بنتی ہے۔ غفور بھائی کو منیجر بنایا ہے۔ دیکھیں کیا کرتے ہیں۔ جاجی کو پلاسٹک کا امپورٹ کروا دیا ہے۔ امریکن کمپنی نے دوسری اسّی فرموں کے مقابلہ میں ہمارا انتخاب کیا ہے۔ لائڈز بنک نے ٹھوک کر ہماری حمایت کی ہے۔ راولپنڈی میں دس گھماؤں جگہ خرید لی ہے۔ کوٹھیاں بنانے کا ارادہ ہے۔ ایک بنا بنایا بنگلہ مری میں خریدا ہے۔ ہر دفعہ کرایہ کی سر پھٹول مجھ سے نہ ہوتی تھی۔ مقبول کو لاہور سے لائل پور چھ لاریوں کا پرمٹ لے دیا ہے۔ ابا جان نے تیس ہزار کے رف رف کمپنی کے حصّے خرید لیے ہیں۔ میں تو اس کے حق میں نہ تھا۔ تمھاری ممانی نے کہا تھا۔ ہسپتال ہو کر آنا۔ نہیں تو بی بی ناراض ہو جائیں گی۔ سو بی بی اگر کبھی یہاں آئیں تو میرے متعلق ضرور بتانا۔ تم تو بہت ہی لاغر ہو گئے ہو۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ ابا جان اکثر تمھارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔''

جب وہ چلے گئے تو کامریڈ نے پوچھا۔ ''تھرٹی ون، ان سے روپے لے لیے ہوتے۔ دیکھا نہیں بورژوائی ان کی آنکھوں میں کس طرح چھلک رہی تھی۔''

''معاف فرمائیے گا یہ میرے ماموں تھے۔''

''اور تمھیں روئیں گے؟''

''روئیں نہ سہی پر یہ ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ امیر ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

''امارت بھی خدا بخت آور لوگوں کو دیتا ہے۔'' صوفی ابراھیم نے کہا۔ ''دیکھا نہیں کیا جسم تھا۔ کیا شان تھی۔ کیسی مشتبہ ڈاڑھی اور پر نور چہرہ۔''

''ہر بورژوائی ایسا ہی ہوتا ہے۔'' کامریڈ نے کہا۔

''یہ بورژوائی کیا ہوتا ہے؟'' صوفی نے پوچھا۔

''کچھ ہوتا ہوگا بھائی! ہمیں اس سے کیا۔'' سپورن نے حقّہ کا گھونٹ بھر کہا۔''میں نے شقو کو ان بازوؤں میں بھینچ بھینچ کر پالا ہے۔''اس کی بیوی، جو چھاچھ میں نمک ڈلی پھیر رہی تھی، رک کر بولی۔''یاد ہے وہ دن جب شقو چڑیا کا بچہ لے کر ہمارے یہاں ل آیا تھا اور پنجے میں ڈور باندھ کر اڑانا چاہتا تھا تو میں نے منع کر دیا کہ اس کی ماں یاد کرتی ہوگی اور اس کی تلاش میں خدا جانے کہاں کہاں ماری پھرتی ہوگی اور اسے چھوڑ دو ورنہ وہ اس کی یاد میں چیخ چیخ کر اپنی جان دے دے گی۔''نور بانو نے چھاچھ کا کٹورا زمین پر رکھ دیا اور اوپر دیکھنے لگی۔''چھت پر چڑھ کر اس نے چڑیا کا بچہ منڈیر پر بٹھا دیا۔'' وہ بولی۔''نیلی نیکر، سنہرے سنہرے بال، سرخ وسفید رنگ، بھولی بھالی باتیں۔ایسے لگتا تھا جیسے ربڑ کے باوے میں جان پڑ گئی ہو۔''

''ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔میں اسے تم سے بہت زیادہ جانتا ہوں۔''بوٹی میاں نے کہا۔''اس کے ساتھ ہی میری داستان گوئی ختم ہوگئی۔کھٹ بڑھئی اور سوداگر بچہ کی کہانی اللہ جانے اس نے کے مرتبہ سنی لیکن پھر بھی سیر نہ ہوا۔بی۔اے کا امتحان دے کر آیا تو اس مونڈے پر بیٹھ گیا۔میں نے کرسی نکالی۔اپنے صافہ سے جھاڑ کر دی مگر نہیں مانا۔میری روٹی توڑ کر کھانی شروع کر دی۔ہنس کر بولا۔''بوٹی میاں، آج تمھیں بھوکا مانے آیا ہوں۔تم اس کرسی پر بیٹھ کر کھٹ بڑھئی کی کہانی سناؤ اور میں اس روٹی کی فریاد سنتا ہوں۔''میں ہچکچایا تو روٹی چھوڑ کر رونکھا ہوگیا۔''اچھا اب میں تمھارے یہاں نہیں آؤں گا۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔شروع کر دیا کہ۔''سوداگر کا بچہ کھٹ بڑھئی کو لے کر چل دیا۔چل سو چل۔منزل در منزل۔کوچ در کوچ۔آگا نزدیک پیچھا دور۔ایک جنگل میں پہنچا۔دیکھا کہ ایک حور پری چندے گلاب چندے ماہتاب بال بال موتی پروئے سولہ سنگھار کیے بیٹھی ہے۔۔۔۔'' پھر ہنس پڑا اور روٹی کھانی شروع کے دی۔کہانی ختم ہوگئی اور اس نے لفافے میں ہاتھ ڈال کر کالی سیاہ مشہدی لنگی نکال کر میری گود ڈال دی۔یاد ہے نا، نور بانو، وہی لنگی جو تیرا بھائی لے گیا تھا۔۔۔۔۔مجھ سے بار بار پوچھتا رہا۔''پسند ہے، بوٹی میاں، پسند ہے لنگی''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پسند۔۔۔۔۔۔پسند کی بھی ایک ہی۔۔۔۔۔۔۔''بوٹی میاں کے گوشہ چشم سے دو موٹے موٹے آنسو باہر جھانکنے لگے جو بعد ازاں پھسل کر اس کی چھدری ڈاڑھی میں جذب ہوگئے۔نور بانو نے کیا۔''یہ مر غیاں بہت تنگ رتی ہیں۔اللہ ان کا بیڑا غرق کرے۔''

''اللہ مرغیوں کا بیڑا غرق نہیں کرتا۔''بوٹی نے پرے تھوک کر کہا۔''وہ تو۔۔۔۔۔۔۔وہ تو۔۔۔۔۔۔۔۔اب میں کیا کہوں اللہ میاں کو۔''

نور بانو جھاڑو دے کر مرغیوں کے پیچھے لپکی تو وہ کٹکٹاتی پھڑ پھڑاتی باہر بھاگ گئیں۔

''ٹھرتی ون، ایک خوش خبری سنو گے؟''مسٹر بھومکا نے شقو کی کھلی آنکھیں دیکھ کر کہا۔

''ڈاکٹر شاہ آئے تھے، ابھی گئے ہیں۔آدھ گھنٹے تک مجھے دیکھتے رہے۔کہتے تھے۔تمھارا ایک لنگ تو بالکل اوکے ہے۔ذرا سا بھی پنکچر نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔۔اور بھئی۔۔۔۔۔ہاں وہ تمھارے متعلق بہت فکر کرتے تھے۔بیٹرس کو بتا رہے تھے کہ ہارڈلی ون ویک آرسو۔مگر تم گھبراؤ نہیں یار۔ڈاکٹر لوگوں کے اندازے غلط ہی ہوتے ہیں۔''

''اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔''شقو مسکرانے لگا۔''مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔ایک ہفتہ تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔بہت